Fikr-o-Nasar (Islamabad) 47:2 (2009)

فکر و نظر............ اسلام آباد جلد: ۴۷ شمارہ: ۲

جنوبی ایشیا میں اسلامی قانونی فکر اور ادارے

ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد کا ایک اہم سیمینار (رُوداد)

سعدیہ تبسم☆

ادارۂ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد نے یکم تا ۳ اگست ۲۰۰۹ء میں ''جنوبی ایشیا میں اسلامی قانونی فکر اور ادارے'' کے عنوان سے ایک فقہی سیمینار کا انعقاد کیا جس میں برصغیر کے ممتاز اہل علم نے شرکت کی۔ اس سے پہلے ادارہ نے ''برصغیر میں مطالعہ قرآن'' اور ''برصغیر میں مطالعہ حدیث'' کے زیرعنوان دو سیمینار منعقد کیے تھے۔ اسی طرح اس ادارہ نے اہم سیمینار ''اجتماعی اجتہاد'' کے موضوع پر منعقد کیا تھا۔ اس سیمینار کو بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی سمجھنی چاہئے۔ اس سیمینار میں اسلامی فقہ اور اسلامی قانونی فکر سے متعلق بعض نہایت اہم موضوعات پر اہم مقالے پیش کیے گئے۔ ان میں بعض منتخب مقالات کے متعلق فقہ کی ایک متعلمہ کی حیثیت سے میں اپنے تأثرات اس مضمون میں پیش کروں گی۔

برصغیر میں اجتہاد کے متعلق مباحثہ

عصر حاضر میں اسلامی قانون پر کی جانے والی کوئی بھی بحث اجتہاد کے ذکر کے بغیر ادھوری ہوگی۔ اسلامی قانون کی روشنی میں عصری مسائل کا حل اجتہاد کے بغیر ممکن نہیں۔ اجتہاد نے اگر ایک طرف اسلامی قانون کے ارتقاء کو ممکن بنایا ہے تو دوسری طرف مسلم امہ کو قرآن و سنت کی نصوص اور ائمۂ سلف کی تعبیرات سے جوڑے بھی رکھا ہے۔ اس وجہ سے اجتہاد مسلمانوں کے ماضی اور مستقبل کے درمیان پل کا کام دیتا ہے۔ اسلام کے تصور اجتہاد اور عیسائیت کے تصور اصلاح مذہب (Reformation) میں یہی وجہ امتیاز ہے۔ بیسویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کو جن مسائل کا سامنا کرنا پڑا ان کی وجہ سے اجتہاد کی ضرورت کا احساس بہت قوی ہوا۔ مختلف اہل علم کی جانب سے اجتہاد کی مختلف تعبیرات سامنے آئیں۔ بعض لوگوں نے اجتہاد اور تجدید و احیائے دین سے آگے بڑھ کر عیسائیوں کی پروٹسٹنٹ تحریک کی طرز پر اسلام کی ازسرنو تشریح کی دعوت دی، تو بعض دیگر حلقوں کی جانب سے ائمۂ سلف کی تعبیرات سے یک سر مو انحراف کو ناجائز قرار دیا گیا۔ اسی طرح بعض اہل علم نے محدود پیمانے پر اجتہاد کی گنجائش تسلیم کی تو بعض دیگر اصحاب نے اجتہاد مطلق کے امکان پر

☆ ریسرچ ایسوسی ایٹ، ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی،اسلام آباد۔

DMHL

© Dr Muhammad Hamidullah Library, IIU, Islamabad. http://iri.iiu.edu.pk/

بھی روشنی ڈالی۔ بعض مسائل پر اہل علم نے مشترکہ رائے اپنانے کی کوشش کی تو ''اجتماعی اجتہاد'' کی اصطلاح بھی وجود میں آئی۔

اجتہاد کے متعلق جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے مکالمے کا جائزہ لینے کے لئے ادارہ تحقیقات کے اس سیمینار میں ڈاکٹر قاسم زمان صاحب، پروفیسر پرنسٹن یونیورسٹی، امریکا کا کلیدی خطبہ رکھا گیا تھا۔ اس خطبے کا عنوان تھا Evolving Conceptions of Ijtihad in Modern South Asia (جدید جنوبی ایشیا میں اجتہاد کے ارتقاء پذیر تصورات)۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں اجتہاد کے تصور نے مسلمانوں کے باہمی مکالمے میں جو اہمیت حاصل کی، ڈاکٹر قاسم زمان نے اس کے تین عوامل ذکر کئے:

اولاً: بعض مسلمان متجددین (Modernists) نے بعض ان امور میں بھی اجتہاد کی دعوت دی جن کو مسلمان قطعی سمجھتے آئے ہیں۔

ثانیاً: بعض حکمرانوں کی جانب سے مختلف نوعیت کی قانونی اور عدالتی اصلاحات بھی اجتہاد کے نام پر نافذ کی گئیں۔

ثالثاً: انیسویں صدی کے اواخر میں قرون وسطی کے فقہی کام پر تنقید کو بھی سلفی علماء نے اجتہاد کے نام سے تعبیر کیا۔

ڈاکٹر زمان نے واضح کیا کہ ان مختلف عوامل کی وجہ سے سنی علماء نے اجتہاد کے متعلق بالعموم احتیاط کا رویہ اپنایا جس کا ایک سبب علماء کا یہ تأثر تھا کہ صدیوں کی محنت سے وجود میں آئے ہوئے فقہی ذخیرے کو نظر انداز کرکے نئے سرے سے کام شروع کرنا وقت اور توانائی کا ضیاع ہے۔ تاہم علماء ہی میں بعض نے ان اصطلاحات اور تراکیب کا استعمال شروع کیا جن کو ڈاکٹر زمان نے ''اجتہاد کی زبان'' (The Language of Ijtihad) کا عنوان دیا۔ اس تناظر میں ڈاکٹر قاسم زمان نے مشہور مستشرق جوزف شاخت کی اس رائے کا ذکر کیا کہ مشرق وسطی میں اگرچہ متجددین کی تعبیرات کو علماء کلیتًا قبول نہیں کرتے لیکن ان کی اس کاوش کو جائز مانتے ہیں اور ایک طرح سے ان کے مشیروں کی حیثیت سے کام کرتے نظر آتے ہیں اور اسی بناء پر وہاں ایک مخصوص فقہی مسلک کی غیر مشروط اور کلی پابندی کی روایت دم توڑتی نظر آتی ہے، جبکہ جنوبی ایشیا میں علماء نے اجتہاد کو نسبتًا قبولیت دی ہے۔ ڈاکٹر زمان نے کہا کہ جنوبی ایشیا کے علماء کے متعلق شاخت کا یہ تاثر بڑی حد تک صحیح معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس بات کی طرف بھی توجہ دلائی کہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں مشرق وسطی میں اجتہاد کے حق میں علماء کے حلقہ سے آواز اٹھی، جبکہ ہندوستان

میں یہ آواز اٹھانے والے متجددین تھے اور علماء نے اس کی مزاحمت کی اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

ڈاکٹر زمان کی یہ رائے کافی وزن رکھتی ہے لیکن ہماری ناقص رائے میں یہاں کچھ خلط مبحث پایا جاتا ہے کیونکہ جنوبی ایشیا کے علماء نے جس نوعیت کے اجتہاد کی مزاحمت کی وہ صرف نام ہی کا اجتہاد تھا، ورنہ درحقیقت وہ اسلام کی ایک ایسی نئی تعبیر تھی جس کی وجہ سے مسلمانوں کا ماضی سے رشتہ منقطع ہو جاتا۔ اس کے برعکس مشرق وسطی کے اہل علم جس نوعیت کے اجتہاد کی دعوت دے رہے تھے جنوبی ایشیا کے علماء کے ایک بڑے حلقے نے اس کی تائید کی جیسا کہ ڈاکٹر زمان نے آگے اپنے خطبے میں خود ذکر کیا۔ علامہ محمد اقبال نے بڑی شدت سے اجتہاد کی اہمیت پر زور دیا اور یہاں تک کہا کہ دور جدید کا مجدد وہ شخص ہوگا جو اسلامی قانون کی تشکیل نو کا کام انجام دے سکے گا۔ تاہم اس کے باوجود انہوں نے اپنے خطبہ الہ آباد میں صراحتاً قرار دیا کہ مارٹن لوتھر کی تحریک اصلاح مذہب کی نوعیت کی کسی تحریک کی اسلام کو ضرورت نہیں ہے۔

مسلمانوں کی قانونی فکر پر جدید ریاستی اداروں کے اثرات

ڈاکٹر زمان نے مشرق وسطی اور جنوبی ایشیا کے اہل علم کے رویوں کے درمیان فرق کی ایک وجہ یہ ذکر کی کہ مشرق وسطی میں ریاست کے لیے قانونی اصلاحات نافذ کرنا نسبتاً آسان تھا جبکہ جنوبی ایشیا کے معروضی حالات کی وجہ سے برطانوی استعمار نے مذہبی امور اور قوانین میں عدم مداخلت کا رویہ اختیار کیا اور ان امور میں ہر مذہبی گروہ کے علماء کو اپنے مسائل کے حل کا حق دیا۔ انہوں نے کہا کہ ہندوستان اور پاکستان میں اب تک علماء بڑے جوش و خروش سے اپنے اس حق کی حفاظت کرتے ہیں۔

میں یہاں اس بات کا اضافہ ضروری سمجھتی ہوں کہ یہ بات صرف برطانوی عہد کی حد تک ہی صحیح نہیں بلکہ اسلامی قانون کی تشکیل اور تدوین کا سلسلہ ابتداء ہی سے ریاست کے اثر سے آزاد رہا ہے۔ چنانچہ اموی اور عباسی دور میں بھی حکومتیں اور عدالتیں فقہاء کی آراء نافذ کرتی تھیں اور اسلامی قانون کی روشنی میں کسی مسئلے کے حل کے لئے لوگ حکمران کے بجائے فقہاء کی طرف رخ کرتے تھے۔ بعد میں جب اسلامی قانون نے ارتقاء کے مختلف مراحل طے کئے تو فقہاء اور حکومت کے درمیان ایک طرح کی تقسیم کار ہوئی جس کی رو سے حکمران کے لئے اس کے مخصوص دائرہ کار میں قانون سازی کا اختیار تسلیم کیا گیا لیکن اس اختیار کے استعمال میں حکمران پر اسلامی قانون کے قواعد

عامہ کی پابندی لازمی تھی۔ البتہ ڈاکٹر زمان کی یہ بات قابل توجہ ہے کہ مذہبی امور میں عدم مداخلت کے باوجود جدید ریاست نے دنیا کے دیگر خطوں کی طرح جنوبی ایشیا میں بھی مذہبی اور قانونی فکر کو متأثر کیا۔ چنانچہ مولانا اشرف علی تھانوی نے اگر فسخ نکاح کے مسائل میں مالکی فقہاء کی رائے اختیار کی تو اس کا بڑا سبب وہ قانونی نظام تھا جو برطانیہ نے ہندوستان میں قائم کیا تھا اور جس کی موجودگی میں حنفی فقہ کی جزئیات پر عمل سے مسائل پیدا ہو رہے تھے۔

مجلس قانون ساز اور اجتماعی اجتہاد

اپنے خطبے میں ڈاکٹر قاسم زمان نے ایک اہم نکتہ یہ اٹھایا کہ علماء کے حلقہ میں اجتہاد کی قبولیت میں بنیادی کردار اجتماعی اجتہاد کے تصور نے ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ اگرچہ اجتہاد بنیادی طور پر ایک انفرادی کاوش کا نام ہے لیکن بیسویں صدی عیسوی میں اس کاوش کو اجتماعی شکل دینے کے لیے کئی کوششیں ہوئیں۔ اس ضمن میں انھوں نے رشید رضا اور علامہ محمد اقبال کی اس رائے پر تفصیلی روشنی ڈالی کہ جدید دور میں مختلف مسائل میں اجماع کے حصول کے لیے مجلس قانون ساز ایک بنیادی فورم کا کردار ادا کرسکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ تجویز خواہ بظاہر کتنی متأثر کن لگتی ہو لیکن عملی دنیا میں شاید قابل نفاذ نہیں ہے۔ علمائے کرام کے حلقے میں اس تجویز کو قبولیت حاصل نہیں ہوئی جس کی ایک وجہ ڈاکٹر زمان نے یہ ذکر کی کہ جدید جمہوریت میں مجلس قانون ساز کے فیصلوں کو قانونی حیثیت اس بنا پر حاصل ہوتی ہے کہ وہ عوام الناس کی نمائندگی کرتی ہے جبکہ اسلامی شریعت میں قانونی حیثیت امر شرعی کی بنیاد پر حاصل ہوتی ہے۔ ہماری ناقص رائے میں ڈاکٹر زمان کی یہ بات نہایت اہم ہے۔ چونکہ اسلامی قانون کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی شارع ہے اس لئے بعض حلقوں کی جانب سے یہ رائے بڑے شدومد کے ساتھ پیش کی جاتی رہی ہے کہ جمہوریت ایک مشرکانہ نظام ہے کیونکہ مجلس قانون ساز کے لئے تشریعی اختیارات قبول کر کے لوگ شرک کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اس موضوع پر اگرچہ بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن اس کے باوجود تاحال مسلمان اہل علم کوئی متفقہ موقف اختیار نہیں کرسکے۔ پاکستان میں ریاست اور حکومت کے خلاف مسلح مزاحمت کی تحریکیں جمہوریت کو مشرکانہ نظام قرار دے کر حکمرانوں اور کی حفاظت پر مامور اہل کاروں بلکہ ان کا انتخاب کرنے والے عوام الناس کو مرتد قرار دیتے ہیں۔ یہ موضوع ایک مستقل سیمینار کا متقاضی ہے۔

اجتماعی اجتہاد کے تصور کی مقبولیت

ڈاکٹر قاسم زمان نے اس بات کی طرف بھی توجہ دلائی کہ مجلس قانون ساز کو اجتہاد کا حق دینے کی مخالفت کے باوجود علماء نے اجتماعی اجتہاد کے تصور کو پسند کیا ہے۔ ہماری ناقص رائے میں اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ مجلس قانون ساز کے برعکس اجتماعی اجتہاد کے اداروں میں فیصلوں کا اختیار اسلامی قانون کے ماہرین کے پاس ہوتا ہے جو اسلامی قانون کے مسلمہ اصولوں کی روشنی میں نئے پیش آمدہ مسائل کا حل ڈھونڈتے ہیں۔

ڈاکٹر زمان نے اپنے خطبے میں ورلڈ مسلم لیگ کی فقہ اکیڈمی اور اسلامی کانفرنس کی تنظیم کی فقہ اکیڈمی کا بھی اجمالی ذکر کیا لیکن انھوں نے بالخصوص فقہ اکیڈمی انڈیا کی کاوشوں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ اگرچہ اجتماعی اجتہاد کے اداروں میں مختلف فقہی مسالک کے علماء ہوتے ہیں لیکن ان میں اکثریت سلفی علماء کی ہوتی ہے، البتہ فقہ اکیڈمی انڈیا پر حنفی، بالخصوص دیوبندی، علماء کا غلبہ ہے۔ انھوں نے واضح کیا کہ شریعت کے مقاصد عامہ۔ حفظ دین، حفظ نفس، حفظ عقل، حفظ نسل اور حفظ مال کے تصور نے بھی قبولیت عامہ کا درجہ حاصل کیا ہے۔ ڈاکٹر زمان کی یہ بات خصوصاً قابل توجہ ہے کہ اگرچہ ان فقہ اکیڈمیز نے زیادہ تر مسائل میں روایتی رائے ہی اختیار کی ہے لیکن بعض مسائل میں انھوں نے اجتماعی اجتہاد اور مقاصد شریعہ کے طریق استدلال کو اختیار کرتے ہوئے نسبتاً مختلف آراء بھی پیش کی ہیں۔ انھوں نے یہ بھی ذکر کیا کہ مقاصد شریعہ کے ذریعہ مسائل کے حل کے لیے مخصوص فقہی مذاہب کی بندشوں کو بعض اوقات توڑنا پڑتا ہے۔ جیسا کہ آگے ہم ذکر کریں گے، ڈاکٹر محمود احمد غازی نے بھی اپنے خطبے میں یہ نکتہ اٹھایا کہ عالمگیریت (Globalization) کی وجہ سے دنیا کے مختلف خطوں میں موجود اہل علم کے درمیان رابطہ آسان ہو گیا ہے اور وہ ایک دوسرے کی رائے سے فوراً آگاہ ہو جاتے ہیں جس کے نتیجے میں ایک ایسی فقہ وجود میں آ رہی ہے جو مخصوص فقہی مسالک کی بندشوں کی پابند نہیں ہے۔ اس کو ڈاکٹر غازی نے ''فقہ عولمی'' (Cosmopolitan Fiqh) کا نام دیا۔

اجتہاد یا اصلاح مذہب؟

خطبہ کے آخر میں ڈاکٹر زمان نے واضح کیا کہ روایتی علماء کے حلقہ میں اجتہاد کی قبولیت کا بنیادی سبب یہ ہے کہ علماء بدلتی دنیا کے معروضی حالات اور تقاضوں کو سمجھ رہے ہیں۔ انھوں نے کہا

کہ پچھلی پوری صدی میں دنیا کے مختلف کونوں میں مختلف حلقوں کی جانب سے اجتہاد اور بعض حلقوں کی جانب سے ''اصلاح مذہب'' کی آوازیں اٹھتی رہیں اور اس صورتحال میں علماء کی جانب سے ''اجتہاد کی زبان'' استعمال کرنے کا محرک یہ تھا کہ عصر حاضر میں دینی روایت کی تعبیر و تشریح کے سلسلہ کو منضبط کیا جائے۔ ڈاکٹر زمان کا اٹھایا گیا یہ نکتہ نہایت اہم ہے کہ تقلید نے کافی عرصہ تک علمی روایت کو منضبط کیے رکھا، جبکہ عصر حاضر میں یہی کام اجتہاد نے کیا ہے۔ اس موقع پر ڈاکٹر زمان نے مولانا مجاہد الاسلام قاسمی کا ایک اقتباس پیش کیا جس میں انھوں نے قرار دیا تھا کہ اگر عصر حاضر کے ان مسائل کے حل کے لیے علماء آگے نہیں بڑھیں گے تو مغرب سے متأثرہ متجددین یہ کام کریں گے اور دینی شعائر و احکام مسخ ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر زمان نے مشہور معاصر دانشور ڈاکٹر طارق رمضان کی کتاب Radical Reform کا حوالہ بھی دیا جس میں طارق رمضان قرار دیتے ہیں کہ مسلمانوں کے عصری مسائل کے حل کے لیے اجتہاد ناکافی ہے اور اس مقصد کے لیے بنیادی سطح پر اصلاح کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر زمان نے کہا کہ طارق رمضان کی اس رائے کی ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اجتہاد کے لفظ کے کثرت استعمال کی وجہ سے اس کا اصل مفہوم دھندلا گیا ہے۔

میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اجتہاد کے ''اصل مفہوم'' سے ڈاکٹر زمان کی مراد کیا ہے؟ کیا وہ ڈاکٹر طارق رمضان کی طرح Radical Reform کو ہی اجتہاد کا اصل مفہوم قرار دیتے ہیں جو مختلف عوامل کی وجہ سے ''دھندلا'' گیا ہے؟ البتہ ڈاکٹر زمان کی یہ بات اہم ہے کہ اجتہاد کے تصور نے مسلمانوں کے مسائل کے حل میں، نیز علماء کے مابین اور علماء اور دیگر اہل دانش کے مابین مکالمے میں اہم کردار ادا کیا ہے خواہ ان کے مختلف گروہوں کے تصور اجتہاد میں باہم کتنا ہی اختلاف پایا جاتا ہو۔

برصغیر میں مطالعہ فقہ: ماضی، حال اور مستقبل

اسلامی قانون کی جزئیات پر بحث میں بعض اوقات تاریخی پہلو کو نظرانداز کیا جاتا ہے حالانکہ ''قانونی فکر'' پر کی جانے والی کوئی بھی بحث تاریخی تجزیے کے بغیر ادھوری ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے اس سیمینار میں ڈاکٹر محمود احمد غازی کا توسیعی خطبہ بعنوان ''برصغیر میں مطالعہ فقہ: ماضی، حال اور مستقبل'' نہایت اہمیت کا حامل تھا۔

ڈاکٹر غازی نے برصغیر میں فقہ کی تاریخِ ماضی کو چار حصوں میں تقسیم کیا: سندھ کا دور، سلاطین دہلی کا دور، مغلوں کا دور اور انگریزوں کی آمد کے بعد کا دور۔ سندھ کے دور کے متعلق انھوں نے فرمایا

کہ اس دور میں برصغیر کی کوئی الگ فقہی حیثیت نمایاں نہیں ہوئی بلکہ دمشق و بغداد کا فقہی رنگ ہی یہاں ظاہر ہوا۔ تاہم انھوں نے کہا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مقامی رنگ تعلیم میں نمایاں ہونے لگا اور بتدریج بہت واضح ہو گیا۔ سلاطین دہلی کے دور کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر غازی نے کہا کہ ساتویں صدی ہجری کے آغاز میں جب شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کی مستقل بالذات حکومت قائم ہوئی تو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ہندوستان کی مرکزی حکومت کے انتظام میں فقہ اور فقہاء کا ایسا بندوبست کیا جائے جو یہاں کی ضروریات کے مطابق ہو۔ انھوں نے قرار دیا کہ برصغیر میں اصل فقہی سرگرمیاں دور سلطنت میں شروع ہوئیں۔ مغلیہ دور کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس دور میں برصغیر کا علاقہ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے علاوہ افغانستان اور ایران کے کچھ علاقوں پر مشتمل تھا۔ انگریزوں کے دور کے متعلق ڈاکٹر غازی نے کہا کہ یہ دور دو سو سال پر محیط ہے جس میں سو سال کمپنی کا دور اور سو سال انگریزی حکومت کا دور شامل ہے۔ انھوں نے قرار دیا کہ حال پر اس دور کے گہرے اثرات مرتب ہیں۔ ڈاکٹر غازی نے وضاحت کی کہ ''حال'' سے ان کی مراد زمانۂ حال کے علاوہ ماضی قریب اور مستقبل قریب کا زمانہ ہے اور یہ دور چودھویں صدی ہجری سے شروع ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا اس دور کا نصف اول انگریزی دور سے شروع ہوتا ہے جبکہ نصف دوم میں آزاد مسلم ریاستوں کا دور شامل ہے۔ برصغیر کے فقہاء کے ضمن میں انہوں نے فقیہ شام عبدالرحمٰن الاوزاعی کا بالخصوص ذکر کیا جو سندھ کے سبایا میں سے تھے۔ اسی طرح انھوں نے صاحب سنن امام ابوداؤد سلیمان ابن اشعث، مولانا ابوالحسن، شمس الدین یحییٰ اور دوسرے فقہاء کے کارہائے نمایاں کا ذکر کیا۔

فقہ عولمی کا تصور (Cosmopolitan Fiqh)

ڈاکٹر غازی کے خطبہ میں خاصے کی چیز cosmopolitan fiqh یا ''الفقہ العولمی'' کا تصور تھا جو انہوں نے خطبے کے آخر میں پیش کیا۔ انھوں نے اس تصور کی وضاحت کرتے ہوئے اسے عالمگیریت کا ایک لازمی نتیجہ قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ عالمگیریت کی وجہ سے دنیا کے ایک خطے میں مسلمانوں کو پیش آنے والے مسائل سے دوسرے خطوں کے مسلمان بے نیاز نہیں رہ سکتے۔ ذرائع مواصلات میں بے پناہ ترقی کی وجہ سے دنیا کے کسی بھی کونے میں رونما ہونے والے واقعات کے اثرات پوری دنیا میں محسوس کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر کسی صاحب علم نے کسی مسئلے پر کوئی رائے ظاہر کی تو بہت جلد وہ دوسرے اصحاب علم تک پہنچ جاتی ہے اور وہ اس پر اظہار خیال شروع کر دیتے ہیں۔ اس طرح کچھ ہی عرصے میں بحث مباحثے کے بعد بڑی حد تک ایک متفقہ رائے وجود میں آجاتی ہے ۔ انہوں نے عالمگیریت سے پیدا ہونے والے مسائل اور خطرات کی بھی نشاندہی کی۔ نیز غیرمسلم

ممالک میں مقیم مسلمانوں کے مسائل کی طرف بھی توجہ دلائی۔ انہوں نے کہا معاصر دنیا کے ان مخصوص حالات کی وجہ سے مختلف میدانوں میں جو فقہ مرتب ہو رہی ہے وہ کسی خاص فقہی مذہب کی بندشوں کی پابندی سے بہت حد تک آزاد ہے، بلکہ بسا اوقات ایک ہی مسئلے کے مختلف جزئیات میں مختلف مذاہب کی آراء کو جوڑ دیا جاتا ہے اور اس طرح ایک نئی فقہ وجود میں آجاتی ہے۔ انہوں نے اس کو ''Fiqhi Engineering'' کا نام دیا اور اس سلسلے میں بالخصوص اسلامی بینکاری کی مختلف پراڈکٹس کی مثالیں دیں۔

فقہ عولمی کا یہ تصور دور رس نتائج کا حامل تھا۔ اس لیے بعض شرکائے سیمینار کی تجویز پر یہ طے پایا کہ اس موضوع پر ایک مختصر نشست کا اہتمام کیا جائے۔ چنانچہ ۱۵ اگست ۲۰۰۹ء کو ادارۂ تحقیقات اسلامی کے سیمینار روم میں اس خصوصی مذاکرے کا اہتمام کیا گیا جس میں کثیر تعداد میں اصحاب علم نے شرکت کی۔ اس مذاکرے میں پہلے ڈاکٹر غازی نے فقہ عولمی کے تصور کے خد و خال کی تفصیلی وضاحت کی۔ اس کے بعد پروفیسر عمران احسن خان نیازی، سابق پروفیسر کلیۂ شریعہ، جو اس موضوع پر ڈاکٹر غازی سے اختلاف رکھتے ہیں نے تفصیل سے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ پھر مذاکرے میں شریک دیگر اہل علم نے اس موضوع پر کھلی بحث کی۔ ادارے کے مدیر جناب ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری نے اس مذاکرے کی صدارت کی۔

پروفیسر نیازی نے فقہ عولمی کے تصور پر تبصرہ کرتے ہوئے سوال اٹھایا کہ جسے فقہ عولمی کہا جا رہا ہے اس کے اصول کیا ہوں گے؟ انہوں نے کہا کہ فقہ کی بنیاد اصول فقہ پر ہے اس لیے فقہ عولمی کی تشکیل سے پہلے فقہ عولمی کے اصولوں پر بحث ضروری ہے۔ انہوں نے کہا اصول میں بہت کچھ مشترک ہے اور ان مشترک اصولوں کی بنیاد پر عصر حاضر میں فقہ کے ایک بڑے حصے کی مشترکہ تشکیل کی جا سکتی ہے لیکن اصولوں کی بحث میں پڑے بغیر اگر صرف سہولت اور آسانی کی خاطر یا دنیوی اغراض کے حصول کے لیے مختلف فقہی مذاہب سے ''Pick and Choose'' کیا جائے گا تو اس ''تلفیق'' کے اثرات بہت خطرناک نکلیں گے کیونکہ اس طرح جو چیز وجود میں آئے گی وہ اصولی تضادات کی وجہ سے عملی دنیا میں پنپ نہیں سکے گی۔ انہوں نے کہا جسے ڈاکٹر غازی صاحب نے ''Fiqhi Engineering'' کہا وہ دراصل ''Reverse Engineering'' ہے کیونکہ اسلامی بینکاری والے کرتے یہ ہیں کہ غیر اسلامی بینکوں کے ایک پراڈکٹ کو سامنے رکھ کر اس کو سند جواز عطا کرنے کے لیے اس پراڈکٹ کی مختلف جزئیات کے جواز کے متعلق مختلف فقہی مذاہب کی آراء اکٹھی کر دیتے ہیں اور نتیجے کے طور پر قرار دیتے ہیں کہ یہ پراڈکٹ شرعی لحاظ سے بالکل جائز ہے۔

پروفیسر نیازی نے مزید کہا کہ ایک فقہی مذہب دراصل ایک مستحکم قانونی نظام ہوتا ہے جو بعض مخصوص اصولوں پر قائم ہوتا ہے۔ اس لیے اگر ایک جزیئے میں حنفی رائے لی گئی اور دوسری میں شافعی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک جگہ آپ ''عام'' کو قطعی کہہ رہے ہیں اور دوسری جگہ ظنی، ایک جگہ آپ قول صحابی کو حجت مان رہے ہیں اور دوسری جگہ اس سے انکار کررہے ہیں اور یہی وہ اصولی تضادات ہیں جن کی وجہ سے تلفیق اور فقہ عولمی کا تصور ناقابل قبول اور ناقابل عمل بن جاتا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ ایک فقہی مذہب میں بھی بعض اوقات ایک سے زائد آراء پائی جاتی ہیں لیکن ''فتویٰ'' کے لیے ان میں سے ایک کو منتخب کیا جاتا ہے۔ اس عمل کو ''تخییر'' کہتے ہیں اور اس کے اپنے اصول ہیں اور تخییر محض ذاتی پسند و ناپسند کی بنیاد پر نہیں کی جا سکتی۔ انہوں نے کہا کہ تقلید کو خواہ مخواہ تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے حالانکہ کسی بھی مستحکم قانونی نظام کے لیے ضروری ہے کہ اس میں تقلید کے اصول کو مانا جائے۔ انہوں نے ماتحت عدالتوں پر اعلیٰ عدالتوں کے نظائر کی پابندی کو تقلید کی بہترین مثال قرار دیا۔

ڈاکٹر غازی اور پروفیسر نیازی کے اختلاف میں مجھ جیسے طالب علم کو بولنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ ان اساطین نے جن نکات کی نشاندہی وہ اہل علم کی جانب سے سنجیدہ غور و فکر کے متقاضی ہیں۔

برصغیر پاک و ہند کے عہدسلطنت میں نظام احتساب

پاکستان میں قانونی نظام کو اسلامی شریعت کے سانچے میں ڈھالنے کی کوششوں میں محتسب کے ادارے کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے۔ جنرل محمد ضیاء الحق نے وفاقی محتسب کا ادارہ تشکیل دیا جو اسلامی قانون کی بہ نسبت فرانسیسی قانون کے تصور Ombudsman سے زیادہ مشابہ ہے۔ بعد میں صوبہ پنجاب اور صوبہ سندھ میں اسی طرز پر صوبائی محتسب کے ادارے قائم کیے گئے۔ ۲۰۰۲ء میں صوبہ سرحد میں دینی جماعتوں کے اتحاد کی حکومت بنی تو اس نے ''حسبہ'' کے اسلامی تصور کی بنیاد پر صوبائی محتسب کا ادارہ تشکیل دینے کے لئے ''حسبہ ایکٹ'' صوبائی اسمبلی سے منظور کرایا لیکن اس قانون میں محتسب کو جو وسیع اختیارات دیے گئے تھے ان کو سپریم کورٹ نے دستور پاکستان کے ساتھ تصادم کی بنیاد پر کالعدم قرار دیا۔ اس تناظر میں اس تین روزہ فقہی سیمینار میں جناب ڈاکٹر سفیر اختر، سابق چیف ایڈیٹر ادارۂ تحقیقات اسلامی ،کامقالہ بعنوان ''برصغیر پاک و ہند کے عہدسلطنت میں نظام احتساب'' نہایت اہمیت کا حامل تھا۔

انہوں نے ابتداء میں ضیاء الدین سنامی کی کتاب ''نصاب الاحتساب'' کے مندرجات کا خلاصہ بیان کیا اور مصنف کی صفت نسبتی کے بارے میں کہا کہ نصاب الاحتساب میں انہوں نے اپنا نام و نسب عمر بن محمد بن عوض السنامی لکھا ہے، سنام پٹیالہ (جنوبی ہندوستان) کے قریب ایک قصبہ ہے جسے عہد سلطنت میں سیاسی اہمیت حاصل تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے امام ابن تیمیہ کی تعلیمات بیان کرتے ہوئے بالخصوص رد منکرات، رد بدعات اور اتباع سنت کا ذکر کیا۔ انہوں نے یہ بھی واضح کیا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کی اجتماعی سطح پر ادائیگی کے لیے حسبہ اور احتساب کا تصور اسلامی تاریخ کے ابتدائی ادوار میں بھی موجود تھا اور اسی تصور کی اتباع سلاطین دہلی نے اپنے دور میں کی۔ انہوں نے آخر میں یہ رائے بھی پیش کی کہ منکرات کی روک تھام اور سماجی برائیوں کے خاتمے، نیز بہتر نظم و نسق کے لیے عصر حاضر میں غیر مسلم ریاستوں نے جو تجربات کیے ہیں ان سے بھی فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔

اکبر اور اورنگزیب کے دور میں نظام عدل

برصغیر میں قانونی فکر کے طلبا کے لیے ایک اہم موضوع یہ ہے کہ انگریزوں کے عہد سے قبل عہد مغلیہ میں برصغیر عدالتی و قانونی نظام کس نوعیت کا تھا؟ پھر عہد مغلیہ میں بالخصوص جلال الدین محمد اکبر اور محی الدین اورنگزیب عالمگیر کے دور بہت اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ ان دونوں نے برصغیر پر مجموعی طور پر ایک صدی سے زائد عرصہ تک حکومت کی۔ سوال یہ ہے کہ اس طویل عرصہ تک اتنے بڑے علاقہ میں جو عدالتی و قانونی نظام رائج تھا اس کی تفصیلات کیا تھیں؟ پھر انگریزوں نے عہد مغلیہ کے عدالتی و قانونی نظام کو کس طرح بتدریج تبدیل کیا؟ نیز آج کے پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش کے عدالتی و قانونی نظام میں مغلیہ دور کے نظام کی کیا خصوصیات باقی ہیں؟

ان اہم سوالات کا جائزہ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں شعبۂ قانون کے سربراہ جناب پروفیسر محمد منیر نے اپنے مقالہ بعنوان ''اکبر اور اورنگزیب کے دور میں نظام عدل'' پیش کیا۔ اکبر کے دور میں نظام عدل کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے اکبر کے مخصوص نظریات، بالخصوص طریقت کے متعلق اس کے تصورات پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے اکبر کے دور کی بعض ان خصوصیات پر بھی روشنی ڈالی جو برصغیر پاک و ہند کے قانونی نظام میں اب تک موجود ہیں۔ پروفیسر محمد منیر کی رائے میں اکبر کے دور میں عدلیہ آزاد تھی۔ اس سلسلے میں انہوں نے بالخصوص توہین رسالت کے ایک مقدمے کا ذکر کیا جس میں قاضی عبد النبی نے اکبر کی خواہش کے خلاف ایک برہمن کو سزائے موت سنائی تھی۔

اورنگزیب عالمگیر کی بعض اصلاحات کا ذکر تے ہوئے پروفیسر منیر نے واضح کیا کہ ان میں کئی آج بھی عدالتی نظام کا حصہ ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے بالخصوص اپیل کے نظام کی بات کی۔ نیز انہوں نے ذکر کیا کہ اورنگزیب نے عدالتی فیصلوں کا تحریر کرنا لازم ٹھہرایا جو ''لازمی نظائر'' (binding precedents) کے تصور کی طرف ایک پہلا قدم تھا۔

پروفیسر منیر کا مقالہ اس لحاظ سے بہت اہم تھا کہ برصغیر پاک وہند کے عدالتی و قانونی نظام کے ارتقاء پر عام طور پر جن لوگوں نے کام کیا ہے انھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے چارٹر کے ذکر سے اپنا تجزیہ شروع کرتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلمانوں کے اپنے عدالتی و قانونی نظام کی تفصیلات لوگوں کے سامنے پیش کی جائیں تاکہ ان کی روشنی میں آج کے مسلمان اپنے دور کی ضروریات کی مناسبت سے نظام وضع کر سکیں۔

توہین رسالت کی سزا پر ایک اہم مکالمہ

پروفیسر منیر نے اپنے مقالہ میں دور اکبری کے ایک مقدمہ کا بھی ذکر کیا جس میں اس دور کے ایک ممتاز قاضی عبد النبی نے توہین رسالت کے مرتکب ایک برہمن کو سزائے موت سنائی تھی۔ سوال و جواب کی نشست میں ڈاکٹر سفیر اختر نے فیصلہ کے متعلق اپنے خلجان کا ذکر کیا کہ یہ بظاہر حنفی مذہب کے خلاف نظر آتا ہے۔ محمد مشتاق احمد، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ قانون نے اس موضوع پر فقہاء کی نصوص کا جائزہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ حنفی فقہاء کے نزدیک توہین رسالت کا مرتکب اگر مسلمان ہو تو اس پر ارتداد کے احکام کا اطلاق ہوتا ہے اور اگر اس کا مرتکب غیر مسلم ہو تو حنفی فقہاء اسے سیاسہ قرار دے کر مناسب سزا تجویز کرنے کا اختیار قاضی اور حکمران کے سپرد کردیتے ہیں۔ انھوں نے حنفی فقہاء کی تصریحات کا ذکرکرتے ہوئے کہا کہ اگر ایسا غیر مسلم مجرم کسی رعایت کا مستحق نہ ہو تو اس کو سیاسۃً سزائے موت بھی دی جاسکتی ہے۔ ان کی رائے یہ تھی کہ عبدالنبی کی جانب سے سزائے موت اسی اصول پر دی گئی تھی۔

عام آدمی کے نقطۂ نظر سے تاریخ کا جائزہ لینے کی تجویز

ڈاکٹر سفیر اختر نے سوال و جواب کی نشست میں اس طرف بھی توجہ دلائی کہ سلاطین کے عدالتی نظام کے تذکروں میں بالعموم بادشاہوں کے خلاف فیصلوں کا ذکر کیا جاتا ہے اور اسے عدلیہ کی آزادی کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس بات کو بالعموم نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ عدالتی نظام نے عام آدمی کی زندگی کو کس حد تک متاثر کیا اور یہ کہ معاشرے میں عدل

اجتماعی کس طرح اور کس حد تک ظہور پذیر ہوا۔ جناب ڈاکٹر خرم قادر نے بھی ڈاکٹر سفیر اختر کے تجزیے سے اتفاق کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ عام آدمی کے نقطۂ نظر سے تاریخ کے مختلف ادوار کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے یہ بھی قرار دیا کہ جن ادوار میں عدلیہ آزاد تھی ان میں بھی یہ صورت حال تمام علاقوں میں یکساں نہیں تھی۔ اس لیے انہوں نے ہر علاقے اور ہر دور کے الگ تجزیے کی ضرورت پر زور دیا۔

پاکستان میں رائج فوجداری قوانین-اسلامی قانونی فکر کے چند اہم مباحث

جناب محمد مشتاق احمد، اسسٹنٹ پروفیسر قانون، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد نے عنوان بالا کے تحت اپنا مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ پاکستان میں قوانین کو اسلامیانے کے عمل میں دستوری طور پر دو اداروں کا کردار اہم ہے: اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت لیکن ان اداروں نے ابھی تک ''احکام اسلام'' کی تعریف متعین نہیں کی ہے، نہ ہی قرآن وسنت سے احکام اسلام کے اخذ و استنباط کے لیے اپنے ''اصول فقہ'' کی تشکیل ہے جس کی وجہ یہ ادارے اپنا کام صحیح طریقے سے نہیں کر سکے۔ احکام اسلام سے عدم مطابقت کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ کونسل اور عدالت قوانین کے جواز اور عدم جواز کے لیے ''اباحت اصلیۃ'' کے قاعدے کو نہایت وسعت سے استعمال کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے انصار برنی کیس کا حوالہ دیا جس میں وفاقی شرعی عدالت نے اباحت اصلیہ کے قاعدے کو بنیاد بنا کر قرار دیا کہ خاتون حدود و قصاص سمیت ہر قسم کے مقدمات میں جج بن سکتی ہے۔ اس موقف کی تردید کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ یہ (اباحتِ اصلیۃ) کوئی مسلمہ قاعدہ نہیں ہے، نیز اس سے بہت زیادہ مستثنیات پائے جاتے ہیں جن کی وجہ اسے قاعدہ کلیہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ فقہاء کی تصریحات کو نظر انداز کر کے کونسل اور عدالت براہ راست قرآن وسنت سے استدلال کر تے ہوئے پہیہ کو دوبارہ ایجاد کرنے کے چکر میں پھنس جاتی ہیں اور اس طرح نہ صرف وقت اور توانائی کا ضیاع ہوتا ہے بلکہ اس کوشش میں قانون بھی اندرونی تضادات کا شکار ہو جاتا ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں ''تلفیق'' کے طریق کار کو بالخصوص تنقید کا نشانہ بنایا۔ نیز انہوں نے اسلامی قانون میں حقوق کی تقسیم کا ذکرکرتے ہوئے حق اللہ اور حق الامام کے درمیان فرق کی توضیح پر زور دیا اور کہا کہ انگریزی قانون کے تصور جرم سے قریب ترین تصور حنفی فقہ کا تصور ''سیاسۃ شرعیۃ'' ہے لیکن دور جدید میں اسلامی فوجداری قانون پر بحث کرنے والوں نے بالعموم اپنی توجہ قصاص، دیت، حدود اور تعزیر پر مرکوز رکھی جبکہ سیاسہ کو بالعموم نظرانداز کر دیا گیا ہے۔

پروفیسر مشتاق کے اس مقالہ میں اٹھائے گئے نکات یقیناً قابل غور ہیں۔ دستور پاکستان میں طے کیا گیا ہے کہ پاکستان میں اسلام کے منافی کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا اور یہ کہ موجودہ رائج الوقت قوانین میں جہاں اسلام کے منافی امور پائے جاتے ہیں ان کو دور کر دیا جائے گا۔ اس پارلیمنٹ کے سامنے مقصد کے لیے سفارشات پیش کرنے کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل کا ادارہ تشکیل دیا گیا ہے لیکن اس کی حیثیت ایک مشاورتی ادارے کی ہے جس کی سفارشات کا ماننا پارلیمنٹ پر لازم نہیں ہے۔ البتہ دستوری لحاظ سے پارلیمنٹ پر لازم ہے کہ جب اس کے سامنے کونسل کی سفارشات پیش کی جائیں تو وہ چھ ماہ کے اندر ان کا جائزہ لے۔ یہ امر نہایت افسوسناک ہے کہ کونسل کی سفارشات کو پالیمنٹ نے کبھی درخور اعتناء نہیں سمجھا، نہ ہی کونسل نے اپنی رپورٹس پر عملدرآمد کو یقینی بنانے کے سلسلے میں کسی سرگرمی کا مظاہرہ کیا ہے۔ مزید برآں کونسل کی سفارشات جو سالانہ رپورٹوں کی صورت میں تیار ہوتی ہیں ''صیغۂ راز'' میں رکھی جاتی ہیں۔ اس لیے وہ عوام الناس کے علم میں نہیں آتیں۔ اسی طرح وفاقی شرعی عدالت، جو جنرل محمد ضیاء الحق کے دور میں قائم کی گئی، نے قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے سلسلہ میں بعض اہم فیصلے سنائے ہیں۔ پاکستان میں قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لیے کام کرنے والے افراد، اداروں اور جماعتوں پر لازم ہے کہ وہ ان دونوں اداروں کے کام کا مفصل تنقیدی جائزہ پیش کریں تاکہ اب تک کیے گئے کام کی خوبیوں اور خامیوں کا بھی اندازہ ہو جائے اور آئندہ کے لیے لائحہ عمل بھی تیار کیا جائے۔

برصغیر میں مسلم عائلی قوانین کے ارتقاء، نفاذ اور اثرات کا جائزہ

عنوان بالا کے تحت ایک اہم مقالہ محترمہ مسز شگفتہ عمر، انچارج شعبۂ خواتین، دعوہ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد نے پیش کیا۔ انہوں نے کہا کہ برصغیر میں مسلمانوں کے دور حکومت میں اسلام کے فوجداری، دیوانی اور عائلی قوانین ملکی قوانین کی حیثیت سے نافذالعمل تھے اور غیرمسلموں کو اپنے شخصی قوانین پر عمل کی آزادی تھی۔ مقالہ میں انھوں نے بعض قوانین کا جائزہ بھی پیش کیا جن میں تنسیخ نکاح ایکٹ ۱۹۳۹ء، گارڈینز اینڈ وارڈز ایکٹ ۱۸۹۰ء، بندش بچگانہ شادی ایکٹ ۱۹۲۹ء زیادہ اہم ہیں۔ آخر میں انھوں نے پاکستان میں رائج عائلی قوانین کو بہتر بنانے کے لیے چند تجاویز دیں۔

فتاویٰ تاتارخانیہ-ایک تعارفی مطالعہ

سیمینار میں ایک اہم مقالہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ اسلامیات کے چیئرمین پروفیسر ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی نے ''فتاویٰ تاتارخانیہ-ایک تعارفی مطالعہ'' کے زیرعنوان پیش کیا۔ انہوں نے فتاویٰ

کی تیس جلدوں کا ایک عمومی جائزہ پیش کیا اور اسے ''فقہی انسائیکلو پیڈیا'' قرار دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی واضح کیا کہ فتاویٰ کے مشتملات ہدایہ کے انداز پر مرتب کیے گئے ہیں اور اس میں وہ تمام مسائل زیر بحث آئے ہیں جو فقہ حنفی کی کتابوں میں عام طور پر ملتے ہیں۔ انہوں نے بالخصوص ان مسائل کا ذکر کیا جن سے کسی غیر مسلم اکثریتی معاشرے میں رہنے والی مسلمان اقلیت کو واسطہ پڑ سکتا ہے، جیسے غیر مسلم والدین کے ساتھ سلوک، غیرمسلموں کو ہدایا دینے اور ان سے ہدایا وصول کرنے کا جواز، غیرمسلموں کے ساتھ معاشرتی تعلقات کی حدود وغیرہ۔ ڈاکٹر قاسم زمان جو اس موقع پر صدارت کررہے تھے نے اہل علم کو فتاویٰ تاتارخانیہ کی ان جزئیات پر خصوصاً کام کرنے کی دعوت جو غیر مسلم معاشرے میں اقامت پذیر مسلمانوں کو پیش آتے ہیں۔

پاکستان میں فقہ و افتاء کے رجحانات-جائزہ و تجاویز

عنوان بالا کے تحت مولانا محمد زاہد، جامعہ امدادیہ، فیصل آباد نے ایک اہم مقالہ پیش کیا۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان بننے سے پہلے فقہ و افتاء کا کام دارالعلوم دیو بند کے اکابر علماء سرانجام دیتے تھے جبکہ قیام پاکستان کے بعد یہ کام یہیں سے فارغ التحصیل لوگوں نے آگے بڑھایا۔ انھوں نے فقہ و افتاء کا نظام بہتر بنانے کے لئے چند تجاویز پیش کیں۔ انہوں نے بالخصوص اس بات پر زور دیا کہ فقہی مسائل کے حل کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے میں موجود مسائل کا سائنسی انداز میں تجزیہ کیا جائے، سروے کیے جائیں اور اعداد وشمار جمع کیے جائیں۔ ان کی یہ بات نہایت قابل غور تھی کہ اگر کسی مسئلہ میں طلاق کے وقوع اور عدم وقوع دونوں کا امکان ہو تو مفتیان کرام بالعموم وقوع کا فتویٰ دیتے ہیں لیکن اگر مفتیان کرام کے سامنے اعداد و شمار اور تحقیقی جائزے پیش کیے جائیں کہ طلاق واقع ہونے سے عملاً کس طرح کے پیچیدہ مسائل پیدا ہوتے ہیں تو وہ طلاق واقع ہونے کا فتویٰ دینے سے پہلے دس دفعہ سوچیں گے۔

جد و جہد آزادی اور فتاویٰ-انیسویں صدی میں

جناب محمد ارشد، دائرۂ معارف اسلامیہ، جامعہ پنجاب نے عنوان بالا کے تحت ایک وقیع مقالہ پیش کیا جو کئی پہلوؤں سے وطن عزیز کے موجودہ حالات کے تناظر میں اہمیت کا حامل تھا۔ ان کا مقالہ دو حصوں پر مشتمل تھا۔ پہلے حصے میں انہوں نے ۱۸۰۳ء میں مغلیہ دار السلطنت دہلی پر انگریزوں کے تسلط سے لے کر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی تک منظر عام پر آنے والے فتاویٰ کا جائزہ لیا۔ ان فتاویٰ میں بالعموم ہند وستان کو دارالحرب قرار دے کر غیر مسلم اقتدار کو ختم کرنے کے لیے مسلمانوں پر جہاد کو

شرعاً فرض قرار دیا گیا۔ اس سلسلے میں شاہ عبد العزیز محدث دہلوی، شاہ اسماعیل شہید اور مولانا عبد الحئ بڈہانوی کے فتاویٰ کا انہوں نے خصوصاً ذکر کیا۔ ان کے مقالے کے دوسرے حصے میں ان فتاویٰ کا تجزیہ پیش کیا گیا جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی اور انگریزوں کے اقتدار کے بعد جاری کیے گئے۔ ان فتاویٰ میں ملک کو دارالاسلام اور دارالامان قرار دے کر جہاد و مزاحمت کی ممانعت کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے بالخصوص مولانا سید نذیر حسین دہلوی اور اور مولانا محمد حسین بٹالوی کے فتاویٰ کا ذکر کیا۔

پاکستان کے مختلف علاقوں میں مختلف گروہوں کی جانب سے ریاست اور حکومت کے خلاف جس مسلح مزاحمت کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے اس پر بحث کے ضمن میں کئی لوگ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ کیسے ان حالات میں بعض علماء کی جانب سے جہاد کی فرضیت کا فتویٰ دیا جاتا ہے اور بعض دوسرے علماء کی جانب سے انہی حالات میں بعض شرائط کی عدم موجودگی یا بعض موانع کی موجودگی کی وجہ سے جہاد کے حکم کی عدم موجودگی کا فتویٰ جاری کیا جاتا ہے؟ میری ناقص رائے میں اس پیچیدہ مسئلہ کی فہم کے لیے ضروری ہے کہ ان فتاویٰ اور ان میں پیش کیے گئے طرز استدلال کو سمجھا جائے۔ جناب محمد ارشد کا مقالہ اس سلسلہ میں ایک اہم کاوش ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں فقہی تحقیق و تصنیف-عربی مخطوطات اور اردو مطبوعات کا تنقیدی جائزہ

جناب ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی، جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے تشریف لائے تھے نے عنوان بالا کے تحت اپنا وقیع مقالہ پیش کیا جس میں انہوں نے متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کی فقہی کاوشوں کا ایک تجزیاتی اور ناقدانہ جائزہ پیش کیا۔ ان کی رائے یہ تھی کہ فقہی سرمایہ کا قابل لحاظ حصہ سلاطین کی سرپرستی میں تیار ہوا۔ اس ضمن میں انہوں نے عہد سلاطین کے قدیم ترین مجموعہ ''الفتاویٰ الغیاثیہ'' کا خصوصی جائزہ پیش کیا۔ انہوں نے واضح کیا کہ اس کتاب میں ان مسائل کا خصوصی ذکر کیا گیا ہے جن کو کتاب کے دور تالیف میں اہمیت کے حامل تھے مثلاً نکاح کے ایجاب و قبول میں فارسی کے جملوں کا استعمال، فارسی زبان میں قرأت بادشاہ کے سامنے سجدۂ تعظیمی اور عیسائیوں و یہودیوں کی میزبانی وغیرہ۔ اس کے بعد انہوں نے عہد تیموریہ کی فقہی تصنیفات اور ان کے موضوعات کا بھی تنقیدی جائزہ لیا۔

سیمینار کے متعلق چند عمومی تأثرات

بلاشبہ یہ ایک نہایت کامیاب سیمینار تھا اور اس میں پیش کیے گئے بیشتر مقالات کا علمی و تحقیقی معیار بھی بہت اعلیٰ تھا۔ تاہم بعض مقالات میں قانونی اور فقہی سوالات پر بحث کے بجائے محض سرسری سی تاریخی معلومات پیش کی گئیں۔ بہ الفاظ دیگر کئی مقالات analysis کے بجائے description پر مبنی تھے۔ سیمینار کا مرکزی موضوع ''قانونی فکر'' تھا۔ تاہم کئی مقالات میں قانونی فکر کے مباحث نہیں اٹھائے گئے۔ فتاویٰ پر پیش کیے گئے مقالات میں بھی کئی ایسے تھے جن میں فتاویٰ کے مآخذ اور صاحب فتاویٰ کے منہج کے بجائے صاحب فتاویٰ کے حالات زندگی اور مناقب پیش کرنے کا پہلو غالب تھا۔ یہی بات شخصیات کے متعلق پڑھے گئے بعض مقالات کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔

ان چند معروضات سے سیمینار کی علمی حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یقیناً اس سیمینار کے کامیاب انعقاد پر ادارۂ تحقیقات اسلامی کے تمام ارکان اور بالخصوص سیمینار کے منتظمین مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مساعی جمیلہ کو قبول فرمائے۔ آمین!

☆☆☆☆☆